بسم اللہ الرحمن الرحیم

پروفیسر سحر انصاری

علامہ شبلی نعمانی کا اسلوبِ سیرت نگاری

سیرت نبوی ﷺ ایک ایسا موضوع ہے جسے تمام اسلامی معاشروں میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ دنیا کی اکابر شخصیات کو تاریخ میں صرف ان کے عقیدت مند ہی اہمیت نہیں دیتے بلکہ دوسرے مذاہب اور عقاید کے افراد بھی ان کے کوائف اور اقوال و افکار سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ ان کی تحریروں میں وہ احترام اور تقدس موجود نہ ہو جو صاحبانِ عقیدہ کی تصانیف میں ہوتا ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ پر اگر اجمالی نگاہ ڈالی جائے تو آپ ﷺ کی سیرت کے ابتدائی نقوش خود قرآن کریم میں مل جاتے ہیں جن میں آپ کے اخلاق، عادات اور فضائل کا عکس نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ ہی کی حیات مبارکہ کے دور میں جو نعتیہ اشعار ملتے ہیں اور جو صحیح احادیث ان حوالوں سے مرتب ہوئی ہیں۔ ان سے آپ کے شمائل و فضائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اردو میں سیرت نگاری کی روایت عربی اور فارسی سے آئی ہے۔ کئی عربی کتب سیرت کے تراجم بھی ہوئے ہیں۔ کئی اسلامی ممالک میں سیرت کی بعض کتابوں کو ادب کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں نصابی کتابوں میں علامہ شبلی نعمانی کی ''سیرۃ النبی'' کے بعض منتخب حصے یقیناً شامل کیے گئے ہیں لیکن ادب کی تنقید اور ادب کے لوازم کا ایک حصہ بنا کر سیرت نگاری کے ادبی اسالیب پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

اردو کی جدید نثر کا آغاز سر سید احمد خاں اور ان کے اہم رفقائے کار کی تحریروں سے ہوا۔ سر سید نے ضرورتاً ولیم میور کی ''لائف آف محمدؐ'' پر تنقیدی مقالات لکھے اور اس طرح سیرت نگاری کا ایک نیا دور اردو اور برصغیر میں شروع ہوا۔ مولانا شبلی بھی اپنی تمام تر انفرادی افتادِ طبع کے باوجود سر سید ہی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

سر سید احمد خاں کا اسلوب تحریر افادیت اور مقصدیت کا آئینہ دار رہا۔ اس لیے ان کی ساری

توجہ نفس مضمون کی افادیت پر مرکوز رہی۔ شبلی کے اسلوب میں موضوع کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اسلوب کی جمالیات بھی ہم رشتہ ہوتی ہے۔ شبلی نے اپنی تمام تحریروں میں یہ جمالیاتی اسلوب برقرار رکھا ہے۔ سیرت النبی ان کے آخری دور حیات کا کارنامہ ہے۔ کیونکہ وہ تحقیق اور تلخیص کے آدمی تھے اس لیے انہوں نے سب سے پہلی کوشش تو یہ کی کہ سیرت پر جتنی اہم کتابیں دستیاب تھیں ان کا غائر مطالعہ کیا اور پھر اپنے ذہن کو اس بنیاد پر واضح کیا کہ وہ سیرت النبی کن خطوط پر لکھیں گے۔

شبلی چونکہ جدید علم الکلام سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے اس لیے علم الکلام پر مستقل اظہار خیال کے علاوہ انہوں نے ''سوانح مولانا روم'' میں بھی اس سے کماحقہٗ کام لیا۔ سیرت نگاری کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

> اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی۔ علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا۔

آگے چل کر شبلی لکھتے ہیں۔

> ''میں نے سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا۔ یہ کام بظاہر بہت آسان تھا۔ عربی زبان میں سیکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہوسکتی۔''

اگرچہ سیرت کا لفظ اور اس کا اصطلاحی مفہوم بہت واضح ہے لیکن شبلی نعمانی کو اس امر کا احساس بھی تھا کہ ایک طرف تو عام افراد عربی سے دور ہوتے جارہے ہیں اور دوسرے علمی سطح بھی پست تر ہوتی جارہی ہے۔ جسے انہوں نے ''عملِ علم اور ''ناآشنائی فن'' سے تعبیر کیا۔ جو کتابیں فن حدیث اور ارباب رجال کے حوالے سے مرتب کی گئیں انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا شبلی نے مغازی اور سیرت کے فرق کو بھی واضح کیا ہے اور اس امر پر بھی توجہ دلائی ہے کہ بعض مؤرخین مغازی اور سیرت میں فرق نہیں کرتے۔ ہر زاویے سے فن سیرت نگاری کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

> ''سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور یہ فن حدیث نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجے کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے۔ یا ان دونوں کے ہم پایہ ہے۔''

شبلی نعمانی نے سیرت نگاری کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور جرح وتعدیل سے ایسے خطوط متعین کر دیئے جو آئندہ سیرت نگاروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے اور ہوں گے۔ عموماً تحقیق اور شواہد و دلائل سے مزین تحریریں خشک اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ شبلی کے اسلوب کا وصف ہے کہ نہایت فنی اور اساسی نوعیت کے مباحث چھیڑنے کے باوجود ان کی تحریر شگفتہ شستہ اور دلچسپ ہوتی ہے اور ان کا ادبی اسلوب ہر جگہ نمایاں رہتا ہے۔

اسلوب کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ ''آدمی ہی اسلوب ہوتا ہے، لیکن بسا اوقات اسلوب تحریر کا نقص بھی بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی مصنف کو محاورہ بندی کا شوق ہو تو کبھی کبھی ان کا استعمال بے محل اور بے جا بھی ہو سکتا ہے اور رسوئے ادب کا پہلو بھی نکل سکتا ہے۔ اسی طرح داستان گوئی کا اسلوب ہر موضوع کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ شبلی نعمانی کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ادبی لوازم کے ساتھ ساتھ موضوع کے عین مطابق ہوتا ہے اور موضوعات کے تنوع کے باوجود اس میں اپنی شناخت کو گم کرنے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

کسی علمی تصنیف یا تالیف کے لیے ذہن کا صاف اور واضح ہونا ضروری ہے۔ اپنے موضوع کی اہمیت، وسعت اور مواد کی فراہمی اور اپنی تصنیفی سکت کا بھی پورا اندازہ ہونا چاہئے۔ سیرت النبی کی جلد اول کے ابتدائی صفحات کے مطالعے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی کو ان سب امور کا مکمل شعور تھا۔ جہاں انہوں نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ حضور ﷺ کے افعال واقوال کی تحقیق کے لیے آپ کے دیکھنے اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلم بند کیے گئے ہیں، اس کام کے لیے ان کا یہ کہنا درست تھا کہ اداروں کی ضرورت ہوتی ہے پھر بھی انہوں نے تن تنہا یہ ذمہ داری قبول کی جو کمی ان کے اپنے علمی پس منظر میں تھی اس کا بھی اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے واقفیت حاصل کی جائے، میں بدقسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا اس لیے ایک محکمۂ تصنیف کی ضرورت تھی جس میں قابل عربی داں اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں۔ خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی۔

اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے کے بعد سیرت نگاری کے مختلف سلسلوں کا جائزہ لیا۔ ائمہ ائے سلف

کے حالات زندگی کا موازنہ سیرت محمدی ﷺ کی ضرورت سے کیا اور ارباب سیَر کی روایات کا موازنہ کیا۔ اور خاص طور پر حافظ زین الدین عراقی کی اس تحریر کا اقتباس پیش نظر رکھا کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ صحیح بھی اور قابل انکار بھی۔

علامہ شبلی نے چونکہ علم کلام کو سیرت نگاری کے کسی مرحلے پر بھی ترک نہیں کیا۔ اس لیے انہوں نے قابل انکار روایات کو شامل کرنے سے احتراز کیا اور یہی اس سیرت کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

اس پس منظر کے بعد جب ہم علامہ شبلی کی تحریر کے محاسن کی طرف آتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اختصار، جامعیت اور ایجاز میں اعجاز پیدا کرنا ان کے قلم کا خاصہ ہے۔ انہوں نے موسیو لیبان کے اصول عمرانی کا اقتباس سامنے رکھ کر عرب کی قدیم تہذیب و تمدن کا جائزہ معروضی انداز میں لیا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانے میں اوج کمال تک پہنچ چکا تھا کیونکہ اصول ارتقا کی رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعتاً اعلیٰ درجے کی تہذیب و تمدن تک نہیں پہنچ سکتی۔

علامہ شبلی نے لیبان کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے۔ ”یہ ایک قیاسی استدلال ہے“۔

علامہ شبلی کے ادبی اسلوب کا سب سے اچھا اظہار ظہور قدسی کے زیر عنوان ہوا ہے۔ یوں تو یہ پورا باب ہی مثالاً پیش کرنے کے لائق ہے لیکن چند سطور ہی تنگی داماں کے سبب پیش کی جا سکتی ہیں۔

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کے رہ گئیں۔

”لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تر دستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیمؑ، جمال یوسفؑ، معجز طرازی موسیٰؑ، جاں نوازی مسیحؑ سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارض شاہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔“

یہی اسلوب پوری تحریر میں نمایاں ہے اور شگفتگی، دل کشی، شعریت اور جمالیاتی اظہار کے باوجود عبارت کہیں بھی اپنے موضوع سے باہر نہیں نکلتی۔ اسلوب کی یہی خوبی نہ صرف علامہ شبلی نعمانی کو اپنے پیش رو سیرت نگاروں سے ممتاز و ممیز کرتی ہے بلکہ اپنے بعد آنے والے سیرت نگاروں کی مکمل رہنمائی کرتی ہے۔